سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ واقعات چنداں اہمیت نہیں رکھتے "۔

برنی جو کچھ لکھتا ہے، احتیاط کے ساتھ لکھتا ہے، اس لیے اس کے بیان میں براہ راست کسی کذب و دروغ کی مثال بمشکل مل سکتی ہے۔ تاہم ایسی مثالیں معدوم نہیں۔ اور ایک کی جانب اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سلطان کے مشیروں میں کثرت سے فلاسفہ وزنادقہ تھے اور اس سلسلے میں عُبید شاعر کا نام لیتا ہے، حالانکہ کچھ ہی اوپر خود "برنی" کا بیان ہے کہ حکومتِ سابقہ میں عُبید بغاوت کے الزام میں قتل ہوچکا تھا۔ اسے بجائے سہو ونسیان پر محمول کرنے کے اس کی عادت کا نتیجہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بات کہتے ہوئے حق و صداقت کی پروا نہیں کرتا۔

لیکن صریحی غلط بیانیوں سے کہیں زائد اور محذوفات سے کہیں زیادہ خطرناک وہ مثالیں ہیں، جن میں برنی نے رنگ آمیزی سے کام لیا ہے، یا واقعہ کا کوئی ایسا جزیہ چھوڑ دیا ہے جس سے اس کی شکل بالکل مسخ ہوگئی ہے۔

اس کی اس عادت کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ "عین الملک" کی بغاوت کے اسباب و بواعث کے سلسلے میں وہ لکھتا ہے کہ فلاں فلاں اشخاص نے سلطان کے تشدد کے خوف سے دہلی سے بھاگ کر عین الملک کے بھائیوں کے پاس پناہ لی، اس پر سلطان نے حکم دیا کہ وہ پا بہ زنجیر سزا کے لیے لائے جائیں۔ اس شقاوت و جبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان اشخاص کے جدید امان دینے والوں نے ان کی حفاظت کا پورا تہیہ کرلیا اور کھلّم کھلّا بغاوت وغدر پر آمادہ ہوگئے۔ ایک سفّاک و شقی القلب سلطان کے سامنے بےکس مظلوموں کی بے دست و پائی کی یہ کیسی عبرت انگیز تصویر ہے! اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بےکسوں اور مظلوموں کی شریفانہ حمایت کا کیسا پراثر نظارہ ہے۔ شقی القلب بادشاہ اور مظلوم رعایا کا یہ نظارہ تمام تاریخوں میں مشترک ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان شریف النفس ہمدردوں کی صورت کسی اور مرقع میں نظر نہیں آتی!

برنی اس سلسلے میں ایک واقعہ اور صرف ایک واقعہ کو پی جاتا ہے، یعنی یہ نہیں بتاتا کہ آخر یہ مفرورین کیوں اس قدر عتابِ سلطانی سے خائف تھے؟ دوسرے مؤرخین نے جنھیں

اس امر پر زیادہ توجہ نہ تھی کہ اس جزئیہ کے اظہار کا تمام سلسلۂ واقعات پر کیا اثر پڑے گا اس راز سے پردہ اٹھا دیا ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ "یہ وہ زمانہ تھا جب دریائے گنگ کے مغربی علاقوں میں انتہائی شدت کا قحط تھا، یہاں تک کہ انسان نے انسان کو کھانا شروع کر دیا تھا، نہ صرف پنجاب کے غیر آباد اضلاع میں بلکہ خود پائے تخت کے مضافات میں سلطان اس وقت ایک دور دراز مہم سے واپس آیا تھا اور شدید علالت میں مبتلا تھا، تاہم اپنی پوری قوت و مستعدی کے ساتھ اس قہرِ عظیم کے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ سچ یہ ہے کہ انیسویں صدی سے پیشتر ہندوستان کی تاریخ میں اس قدر جامع و مکمل انتظامات کی کوئی مثال نہیں ملتی اس نے دور دراز اضلاع میں جو انتظامات کیے وہ مشہور ہیں، لیکن پایہ تخت میں جو کارروائیاں کیں وہ ذرا غیر معروف ہیں۔ یہاں اس نے یہ کیا کہ پورے شہر کی محققانہ مردم شماری کرائی اور ہر محلہ اور ہر کوچہ کے باشندوں کی مکمل فہرست تیار کرائی، پھر ان آبادیوں کو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کیا اور انھیں ایک ذمہ دار افسر کے حوالہ کر کے یہ حکم دیا کہ روزانہ وقت مقررہ پر ہر حلقے کے ہر متنفس کو سرکاری ذخیرہ سے غذا پہنچ جایا کرے اور اس میں بادشاہ کو ایسا انہماک ہوا کہ مملکت کے دیگر کاروبار سے قطع نظر کر کے اس نے ساری توجہ خلقت کو لقمۂ اجل ہونے سے روکنے میں صرف کر دی۔ ایک طرف یہ انہماک تھا، دوسری جانب سررشتہ کے بعض اہل کاروں کی آتشِ ہوس مشتعل ہوئی اور انھوں نے عطایائے سرکاری میں تغلب و تصرف شروع کیا۔ خفیہ پولیس عرصہ تک بے خبر نہ رہی، کچھ بعد میں بعض مجرم گرفتار ہو کر کیفرِ کردار کو پہنچے۔ لیکن بعض بدکردار اپنی خوش قسمتی سے نکل بھاگے اور "اودھ" پہنچے، یہاں عین الملک کے بھائیوں نے جو مدت سے بغاوت کا منصوبہ باندھ رہے تھے، انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، انھیں جاگیریں عطا کیں اور اپنے رفقاء میں ان کا نام لکھ لیا۔" یہ ہے وہ مخصوص جزئیہ جس کے اظہار کے بعد واقعہ کی صورت کیا سے کیا ہو جاتی ہے اور جس کے چھپانے سے "برنی" کی نیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ "جو لوگ سمجھنا چاہتے ہیں" کیا اُن کے لیے یہ اہم ترین جزئیہ اہمیت نہیں رکھتا؟

از : محمّد یوسف (مرحوم عبدالرحمٰن کے برادرِ خورد)
مترجم : پروفیسر وائی۔ایس۔طاہر علی

جنگِ بلقان کے ایک پاکستانی مجاہد کی شہادت کا پچاسواں سالانہ دن

۲۶ مئی عبدالرحمٰن کی شہادت کا پچاسویں سال کا دن ہے۔ وہ اس دن ۱۹۲۶ء میں ایک نامعلوم قاتل کی گولی لگنے سے استنبول میں نشانۂ اجل بنے۔ ۱۹۱۳ء میں بحیثیت ایک رکن کے مشہور ہندوستانی طبی جماعت کے ساتھ وہ ترکی گئے تھے جس کی قیادت برصغیر کے نامور سرجن ڈاکٹر ایم اے انصاری نے کی تھی اور جو جنگِ بلقان (۱۳-۱۹۱۲ء) کے زخمی ترکی سپاہیوں کی مرہم پٹی اور معالجے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ مرحوم عبدالرحمٰن وطن واپس نہ لوٹے، انھوں نے ترکی قومیت اختیار کرلی اور ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۳ء ترکی کی جنگِ آزادی میں ایک شاندار کردار ادا کیا۔

عبدالرحمٰن ایک سربرآوردہ خاندان کے فرد تھے، ان کے والد حاجی غلام صمدانی پشاور کے مشہور تاجر تھے۔ بچپن کے زمانے سے عبدالرحمٰن کو دنیا کے چوٹی کے سپہ سالاروں کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے دلچسپی تھی۔ لہٰذا آگے چل کر انھوں نے ان سپہ سالاروں کی سوانح حیات کا غائر مطالعہ کیا اور اس ضمن میں نپولین پر خصوصی توجہ کی۔ آخرالذکر سے اُن کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اس کی زندگی کی معمولی معمولی بات بھی اُن کو یاد تھی جس کا وہ خاص خیال

موقع اور محل پر ذکر کرتے تھے۔

ان کی ولادت ۱۸۸۶ء میں پشاور میں ہوئی۔ چوں کہ خاندانی ماحول مذہبی تھا لہذا ان کی دینی تعلیم ابتدا میں گھر پر ہوئی۔ زاں بعد وہ پشاور کے ایک انگلش اسکول میں داخل ہوئے ان کے پدرِ بزرگوار حاجی غلام صمدانی گرچہ جدید تعلیم سے بالکل بے بہرہ تھے لیکن اپنے کاروبار کی چھوٹی سے چھوٹی بات کو خوب یاد رکھتے تھے اور لبسا اوقات اس کو لکھ بھی لیتے تھے۔

علی گڑھ کی زندگی

عبدُالرحمٰن نے ابھی میٹرک کلاس کا امتحان بھی نہیں دیا تھا کہ انھیں علی گڑھ بھیج دیا گیا، جہاں ۱۹۰۶ء میں ایم۔اے۔او کالیجیٹ اسکول کی اعلیٰ جماعت میں انھیں داخلہ مل گیا، ۱۹۰۷ء میں طلبہ نے ایک عام ہڑتال کی جس میں عبدالرحمٰن نے ضرور حصہ لیا ہوگا، کیونکہ اس وقت تک طلبہ میں ملک دوستی اور حب الوطنی کا جذبہ بیدار ہو چکا تھا اور وہ معاصرانہ سیاسی باتوں سے نہایت متاثر معلوم ہو رہے تھے۔ مگر اس سلسلے میں ہمارے معلومات صفر کے مانند ہیں۔ البتہ عبدالرحمٰن ایک ایسے طالب علم کے دوست تھے جو انقلابی کاموں میں سرگرمِ عمل تھا اور جس نے مصر میں برطانوی طرزِ عمل کی کھلے الفاظ میں مذمت کی تھی۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں ان کو تین سال کے لیے علی گڑھ سے نکال دیا گیا۔ لامحالہ ان کو اپنے وطن جانا پڑا جہاں ۱۹۱۱ء میں انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال وہ واپس علی گڑھ آئے کیونکہ تین سال کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ ایم۔اے۔او کالج میں داخلہ لیا اور علم تاریخ اور فنِ حرب پر حتی الامکان توجہ دیتے رہے۔

جنگِ بلقان

روس صدیوں سے اس ٹوہ میں ہے کہ باسفورس اور درہ دانیال پر اُس کا قبضہ ہو جائے اور وہ بحیرۂ روم میں بغیر کسی رکاوٹ کے آجا سکے۔ لیکن سیاسی صورت میں ممکن ہے کہ روس ترکی کو بے دست وپا کر دے۔ اس مقصد کے حصول میں رُوس کو کئی دفعہ مُنہ کی کھانی پڑی لیکن وہ اب بھی اس کے لیے کوشاں معلوم ہوتا ہے۔

۱۸۷۷ء میں رُوس اور ترکی کی جنگ ہوئی اور پھر ۱۸۹۷ء میں ترکی اور یونان میں جنگ

چھڑی۔ ان دو جنگوں کے بعد ۱۹۱۲ء میں مشرق قریب عالمی سیاست کا آماجگاہ بن گیا اور جنگِ بلقان شروع ہوئی۔ اس جنگ کی کہانی ترکی کے نامور مصنف "خالد ادیب" کی زبانی سنیے :-

"عالمی جنگ کے لیے جنگ بلقان نے ایک آزمائشی تماشہ [illegible] کام کیا۔ اس جنگ کی تیاری ازوولسکی (ISVOLSKI) کے دماغ کی مرہون منت ہے [illegible] روس میں امورِ خارجہ کا وزیر تھا۔ وہ انیسویں صدی کے آخری حصے کا یا بیسویں صدی کے اوائلی حصے کا قابل ترین سیاست دان مانا جاتا تھا۔ موجودہ سیاسی بحران اسی کی سازشوں کا نتیجہ ہے۔ ۱۹۰۵ء میں روس کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا اور روس کی زمامِ حکومت ازوولسکی کے ہاتھ میں آ ئی۔ اب ازوولسکی نے یوروپی اقوام کے مفادات اور مقاصد سے کھیلنا شروع کیا تاکہ آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ روس [illegible] ہو جائیں۔ اس مہم میں [illegible] طانیہ اور فرانس کو بھی اپنے ساتھ رکھنا ضروری تھا چنانچہ اس نے انگلستان کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر جاپان سے ۱۹۰۷ء [illegible] مفاہمت کی اور اپنے آپس کے اختلافات دور کیے۔ چین میں اقتدار حاصل کرنے کے مسئلہ پر بھی سمجھوتہ ہوگیا۔ اسی سال افغانستان، تبت اور ایران کے مفادات پر بھی انگلستان سے ایک معاہدہ ہوا، جس کی رُو سے وہ دونوں افغانستان اور تبت سے دست بردار ہو گئے۔ البتہ ایران کو اپنے اثر و رسوخ کی خاطر دو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا۔ مزید براں روس نے جرمنی کا گھیراؤ کرنا شروع کر دیا۔ یہ تمام باتیں انگلستان کو خوش کرنے کے لیے کی جا رہی تھیں پھر بھی برطانیہ اس بات پر تیار نہ تھا کہ روس کا قبضہ آبنائے باسفورس پر ہو جائے۔

سیاسی سودے بازی

اب رُوس نے آسٹریا اور اٹلی کو پٹی پڑھانی شروع کی۔ آسٹریا کو اس نے کھلی چھٹی دے دی کہ وہ بوسنیا (BOSNIA) اور نووی بازار (NOVI BAZAR) پر اپنا قبضہ جمائے۔ علیٰ ہٰذا القیاس اس نے اٹلی کو لیبیا پر اقتدار حاصل کرنے کی اجازت دی۔ لیکن انگلستان اور فرانس بدستور مخالفت کرتے رہے کہ رُوس کا آبنائے باسفورس پر قبضہ نہ ہو تب ازوولسکی کو سوجھی کہ وہ بلقان کی ریاستوں کو اُبھارے کہ وہ متحد ہو کر ترکی کو بلقان سے بھگا دیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طریقے سے فرانس اور انگلستان ایک بڑی جنگ میں ملوث

ہوجائیں گے اور آسٹریا اور جرمنی کو بلقان سے بھگا دیں گے۔ اگر المانیہ اور ترکی میدان سے ہٹ گئے تو روس بہت آسانی سے آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ کی مہم کو سر کرلے گا۔

۱۹۱۰ء میں ازووسکی کو روس کی وزارتی کونسل سے مستعفی ہونا پڑا۔ زاں بعد وہ فرانس میں روس کا سفیر مقرر ہوا۔ فرانس میں اس نے بلقان کی ریاستوں سے گٹھ جوڑ شروع کی۔ ترکی کے خلاف ایک خفیہ معاہدہ ہوا اور اس پر بلغاریہ اور سربیا نے دستخط کیے۔ ۱۹۱۲ء کے موسم گرما میں بلقان کی تقریباً تمام ریاستوں نے ترکی پر حملہ کردیا۔

ہندوستانی طبی جماعت

ان تمام باتوں سے ہندوستانی مسلمان بہت پریشان تھے کیونکہ وہ ترکی کے سلطان کو خلیفۃ المسلمین مانتے تھے۔ علاوہ ازیں مصر پر برطانیہ نے اپنا قبضہ جمایا تھا۔ انگلستان اور فرانس کی باہمی کوششوں سے عراق، شام اور عرب میں ترکوں کے خلاف عرب قومیت کا خیال فروغ پا رہا تھا۔ ترکوں نے شریف حسین کو خوش رکھنے کی بہتیری کوشش کی مگر برطانیہ کے سیم وزر کے آگے ترکو ۔ کچھ نہ چلی۔ ترکوں کی حالت نازک ہوگئی۔ مغربی طاقتیں آبنائے دانی پالیسی کی کتنی مخالف کیوں نہ ہوں پھر بھی انگلستان کے "سر ایڈورڈ گرے" نے گلیڈسٹن کے طرزِ عمل کو ترکی کے خلاف اپنایا اور اس جنگ کو برطانیہ دور سے دیکھتا رہا۔ اور جنگ بندی کی کوئی کوشش نہیں کی۔

برصغیر ہندوپاک کے مسلمانوں نے اس آڑے وقت میں ترکی کی حتی المقدور مدد کی مولانا محمد علی جوہر نے اپنے مشہور اخبار ہفتہ وار کامریڈ میں بڑے زور دار مضامین لکھے اور بلقان میں برطانوی طرزِ عمل کی دھجیاں اڑا دیں۔ چونکہ برصغیر انگریزوں کے زیر نگیں تھا لہذا فوجی امداد کا سوال پیدا ہونا غیر ممکن تھا۔ مولانا نے البتہ ایک طبی وفد ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں بھیجنے کا تہیہ کیا۔ اس وفد میں پانچ تجربہ کار سرجن تھے اور دو درجن دوسرے آدمی تھے جن کا کام زخمیوں کی مرہم پٹی اور پرداخت تھا۔ اس جماعت کے ایک چوتھائی ارکان علی گڑھ کے طلبہ تھے، جن میں پشاور کے عبدالرحمن، عبدالرحمن صدیقی، شعیب قریشی،